© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

علم اور اس کی پنہائیاں

(مولانا ندوی کا صدارتی خطبہ جو انھوں نے شامِ ہمدرد میں پڑھا۔)

اس سے پیشتر کہ ہم علم کی وسعتیں بیان کریں اور یہ بتائیں کہ اس کی حدیں کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اور کون کون موضوع اس کے دائرۂ ادراک میں شامل ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی قدم پر اس لفظ کے تصرفات پر غور کر لیا جائے، اور یہ دیکھ لیا جائے کہ فن اشتقاق کی رو سے ع، ل اور م معنی و مفہوم کے اعتبار سے اپنے آغوش میں کن کن عجیب و غریب پہلوؤں کو لیے ہوتے ہے۔

یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ عربوں نے جس قدر اپنی زبان کو سنوارا، بنایا اور نکھارا ہے، دنیا کی کوئی دوسری قوم اس بارے میں ان کی حریف نہیں ہو سکتی۔ اقوامِ عالم نے زبان کو محض ذریعۂ اظہار قرار دیا ہے، اور الفاظ و حروف کی حیثیت ان کے ہاں اس سے زیادہ نہیں کہ یہ رموز و اعلام (Symbols) ہیں، جو بجائے خود کسی حکمت کے حامل نہیں، لیکن بہرحال مخصوص معانی پر دلالت کناں ہیں۔ لیکن عرب الفاظ و حروف کو ذریعے سے کہیں زیادہ، ایک فن، ایک مقصد اور وہ شئی سمجھتے ہیں جسے صنم کی طرح خوب صورت اور آراستہ پیراستہ ہونا چاہیے۔ جس کی ایک ایک ادا ایسی معنی آفریں ہونی چاہیے کہ دلوں کو لبھائے اور چاہنے والوں کو مسحور کر دے۔ یہ حروف کے انتخاب میں اور الفاظ کی ترکیب و ساخت اور الٹ پھیر میں ایسی نزاکتوں کو ملحوظ و مرعی رکھتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا کوئی انسان، ایسی جچی تلی، فصیح و بلیغ، جامع اور مبنی بر حکمت زبان وضع کر سکتا ہے۔

عربوں کے نزدیک زبان کا مسئلہ ان کے ہنر، ذوق اور تہذیب کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے انھوں نے اپنے جمالیاتی ذوق کی تمام تر توانائیوں کو اس کے بناؤ سنوار میں کھپا دیا ہے۔ علم الاشتقاق (Philology) کے اعتبار سے ع، ل اور م کے حروف علم۔ کے علاوہ جن مزید تین الفاظ کو جنم دیتے ہیں، وہ ہیں،، عما، لمع اور ملع۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عمل اور علم میں رشتہ و تعلق کی ایک نوعیت یہ ہے کہ عمل یا تجربے ہی سے کسی نظریے کی صحت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اگر کوئی نظریہ عمل و تجربے کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو وہ نہ صرف اپنا بھرم کھو بیٹھتا ہے بلکہ دائرۂ علمی سے ہمیشہ کے لیے خارج ہو جاتا ہے۔ فلسفہ و فکر کی تاریخ میں کتنے ہی ایسے نظریات نے جنم لیا جو اپنے دور میں بظاہر نہایت معقول معلوم ہوتے تھے، لیکن آئندہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ ان غلط نظریات کو فکر و خیال کی طرفہ طرازیوں نے پیدا کیا ہے، ورنہ حقیقت نفس الامری سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔ مادہ، ذرہ، حرکت، مکان و زمان اور ارتقا کے بارے میں گزشتہ زمانے میں کس دھوم دھڑکے کے ساتھ مختلف نظریات کو پیش کیا گیا تھا، لیکن آج ان کی حیثیت یہی ہے کہ ہم نے اس طرح بھی کبھی سوچا تھا۔ مقصد یہ ہے، علم و عمل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عمل و تجربے نہ صرف علمی نظریات کی ساکھ قائم ہوتی ہے، بلکہ خود علم و معرفت کا دائرہ مختلف گوشوں اور شاخوں میں پھیلتا اور وسعت پذیر ہوتا ہے۔

علم و عمل میں ربط و اتصال کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ علم جو انسان کو عمل پر آمادہ نہیں کرتا یا سرے سے کسی عملی حقیقت کی صورت میں جلوہ گر نہیں ہوتا، سرے سے علم کہلانے کا سزاوار ہی نہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہنا چاہیے کہ علم و عمل، لازم و ملزوم یا دو توأم حقیقتیں ہیں جن کا ایک ساتھ رہنا اور ایک ساتھ چلنا ضروری ہے۔ نیکی اور حسن کا علم و ادراک اور خود نیکی اور حسن سے بہرہ مند ہونا، ایک ہی شے کے دو نام ہیں، فرق صرف مرتبے اور ڈگری کا ہے، نوعیت و جنس کا نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو سقراط نے اپنے اس حکیمانہ مقولے میں بیان کیا "Knowlege is virtue." اس کے معنی یہ ہیں کہ عالم بے عمل کی اصطلاح یکسر غلط ہے۔ اگر کوئی شخص بے عمل اور بری عادات و اطوار کا حامل ہے تو وہ سرے سے عالم ہی نہیں۔ کتابیں پڑھنے، ڈگریوں کا بار گراں اٹھانے اور کچھ مضامین کو حافظے کی گرفت میں دے دینے کا نام علم نہیں۔ علم قلب و ذہن کی اس کامل تبدیلی کا نام ہے جو انسان کو مقاصد واقعی کے حصول کے لیے سرگرم عمل بنا دیتی ہے۔ علم و عمل کے اسی تضاد کی طرف سورۃ الجمعہ کی اس آیت میں اشارہ ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ (۵)

یعنی جن لوگوں کے سر پر تورات لدوائی گئی پھر انھوں نے اس کے مقتضیات کے بار کو نہ اٹھایا، ان کی مثال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔

اشتقاق کی عجوبہ طرازیوں سے جو ع، ل اور م سے دوسرا لفظ بنتا ہے وہ ہے لمع، اس کے معنی درخشاں ہونے، منور ہونے اور تاباں ہونے کے ہیں۔ یہ علم کی دوسری خصوصیت ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ علم و عرفان نہ صرف ذہن کو صیقل کرتا اور تعصب و جہل کے زنگ کو مٹا دیتا ہے، بلکہ ادراک و معرفت کے نئے نئے اجالوں کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ علم سے اگر فکر و استدلال کے دریچے روشن نہیں ہوتے ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کی تاریکیاں نہیں چھٹتیں اور فکر و خیال یا عقیدہ و عمل میں تابانی و درخشانی کی جھلکیاں نمایاں نہیں ہوتیں تو اسے ہم علم سے تعبیر نہیں کریں گے، جہل اور نادانی کہیں گے۔

علم میں ایک طرح کی روشنی ہے، اجالا اور براقی ہے جو انسان کی سیرت و کردار، چال ڈھال اور فکر و نظر کے ہر ہر گوشے پر اثر انداز ہوتی اور اسے فروزاں کر دیتی ہے۔

ع، ل اور م کے الٹ پھیر سے تیسرا لفظ جو ترکیب پذیر ہوتا ہے، وہ ملع ہے جس کے معنی سرعت سیر کے ہیں۔ عربی میں "جَمَلٌ مَلُوْعٌ" اس اونٹ کو کہتے ہیں جو تیز رو ہو۔ علم و عرفان کی یہ تیسری خصوصیت ہے جو صرف لفظِ علم کے اشتقاقی تصرفات سے سطح ذہن پر ابھرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم ہی وہ خصوصیت ہے، جو زندگی اور تہذیب و ثقافت کے قافلوں کو آگے بڑھاتی اور سعی و مقابلہ کی دوڑ میں قوموں کو سریع السیر بناتی ہے۔ ہماری تاریخ اس حقیقت پر شاہد عدل کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہماری ترقی اور تہذیبی میدان میں تیز روی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ہم نے قرآنی تعلیمات سے سرشار ہو کر اقراء اور اس کے مقتضیات کی وسیع تر اور شاداب وادیوں میں قدم رکھا اور یونان، فارس اور ہند کے خزائن علمی کو کھنگال ڈالا اور ان میں مندرجہ علوم کو اپنے تہذیبی سانچوں میں ڈھالا اور ان میں ایک نیا امتزاج عطا کیا۔ ہماری تاریخ کا یہ وہ زریں دور ہے جس پر ہم جس قدر ناز کریں کم ہے۔ جو قومیں حصول علم سے کنی کتراتی ہیں وہ کبھی بھی زندگی کی کامرانیوں سے ہم کنار نہیں ہو سکتیں۔ ہمارے زوال کا اصل باعث سیاسی اسباب و عوامل سے کہیں زیادہ ہمارا وہ تغافل ہے جو ہم نے علوم و فنون کے بارے میں روا رکھا اور اپنے کو اس دبستان تہذیب و حضارت کی آب یاری اور سرپرستی سے الگ تھلگ رہنے پر مجبور کیا جس کو ہمارے ہی اسلاف نے اپنے خون سے سینچا تھا۔

یہ واضح رہے کہ لفظ علم سے متعلق معانی کا یہ استنباط، جو محض حروف کے دل بدل اور الٹ پھیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے حاصل ہوا، ہماری اپج یا اختراع کا نتیجہ نہیں۔ یہ عربی زبان کی وہ مایہ ناز خصوصیت ہے جس پر ابن جنی اور ابنِ فارس جیسے علم اللسان کے ماہرین نے کافی روشنی ڈالی ہے۔ نامناسب ہوگا اگر ہم اسی پر اکتفا کریں اور اس کے دیگر اہم اور تخلیقی پہلوؤں کو اجاگر نہ کریں اور یہ نہ بتائیں کہ وہ کون عناصر ہیں جن سے علم اپنے سادہ اور عام فہم معنی سے اونچا اٹھ کر اس مقام بلند پر پہنچ جاتا ہے، جہاں سے آپ سے آپ ایجاد و اختراع اور آفرینش و اجتہاد کی اعجوبہ کاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ہمارے نزدیک علم و عرفان کے تین عناصر ہیں جو کسی بھی تہذیب کو صحیح معنوں میں زندہ، فعال اور شگفتہ و شاداب رکھنے کے ضامن ہیں، یعنی انکشاف کا جذبہ۔ مروجہ علمی روح یا عصری فیضان کے ساتھ آشنائی اور اس سے استفادہ و افادہ کا مسلسل اور تدریجی عمل۔

کیوں کہ اگر آپ اپنی علمی کاوشوں سے کوئی نئی حقیقت دریافت نہیں کرتے، سابقہ لگی بندھی معلومات میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں کر پاتے اور حالات و کوائف کے دھارے کو حق و صداقت اور خیر و خوبی کی جانب موڑ دینے کی کوئی کوشش نہیں کرتے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ آپ کا علم تخلیقی نہیں تقلیدی ہے، اجتہادی نہیں رواجی ہے۔ اسی طرح اگر آپ کا ہاتھ زمانے کی نبض پر نہیں ہے اور آپ نہیں جانتے ہیں کہ جس دور میں آپ رہ رہے ہیں، اس کی روح اور مزاج کیا ہے، اس کی ڈکشن اور اسلوبِ اظہار کس احتیاط اور تحقیق کا طالب ہے تو آپ کی آواز قطعی بے اثر رہے گی اور آپ اس دور کی تہذیبی اور عقائدی خرابیوں اور خوبیوں میں اور اس دور کے ذہن و فکر کی اصابت اور کجی میں کوئی حدِ فاصل نہیں قائم کر سکیں گے اور اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کا علم اس دور کے نوجوانوں تک کوئی مثبت اور رجائیات آفریں پیغام نہیں پہنچا سکے گا جو ان کے دلوں کو گرما سکے اور ان کے خیالات و نظریات کے کھوکھلے اور ناہموار بام و در کو بدل کر رکھ دے۔

موجودہ دور کی روح اور مزاج کیا ہے، اس کو جاننے کے لیے ہمارے علما اور دانش وروں کو بیسویں صدی کے ان تمام علوم، تحریکات اور نظریات کا جائزہ لینا ہوگا جو اس وقت دنیا میں رائج ہیں، اور بنظر غائر یہ دیکھنا ہوگا کہ ان میں حسن، خوبی اور نیکی کے وہ کون اجزا ہیں، جنھیں ہمیں اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں سمونا ہے، اپنے تہذیبی سانچوں میں ڈھالنا ہے، اور وہ کون اجزا ہیں جن کو بے کار اور نوعِ انسانی کے حق میں مضر سمجھ کر یہیں چھوڑنا اور برملا ئے حقارت سے ٹھکرا دینا ہے ۔۔۔ تحقیق و تفحص کا یہ عمل مختلف علمی حلقوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اداروں میں تسلسل کے ساتھ اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک ہم یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم نے ان قطعی نتائج تک رسائی حاصل کر لی ہے جن کے بل پر ہم اپنی تہذیب کی برتری اور اپنی عقائدی قدروں کی عظمت اور اپنے دین کی اصابت وحقانیت کو دوسروں سے منوانے کے لائق ہو گئے ہیں۔

جذبۂ انکشاف، روحِ عصر سے آشنائی اور اس کی روشنی میں استفادہ واقدہ کے عمل کا تسلسل و دوام۔ علم کی وہ تین خصوصیات ہیں جو ہمارے علم کو تخلیقی کردار عطا کر سکتی ہیں اور ہمارے داعیانہ اور احیائے اسلام کی کوششوں کو اس لائق ٹھہرا سکتی ہیں کہ ہم اپنے دین کو ایک بار پھر ایک کامیاب تصورِ حیات، ایک منضبط فکر اور انسان کو درپیش جملہ مشکلات کے حل کی صورت میں پیش کر سکیں۔

آخر میں آیئے ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے محیطِ علمی میں علوم و معارف کی پہنائیاں کن کن اہداف و موضوعات کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اس مرحلے پر ہمیں یہ اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ہمارے نزدیک یہاں سے علم و دانش کا مسکن مشرق و مغرب کی تفریق روا رکھے بغیر ہر وہ ذہن، ہر وہ قلب اور عقل و دانش کا ہر وہ مرکز ہے جو علم کی قدر کرے، علم کی روشنی کو چار دانگ عالم میں پھیلائے اور اس میں ایسے اضافے کرے جن سے انسانی فلاح و بہبود کے قافلے آگے بڑھیں اور جن سے اس عالمِ مادی کی ترقی کے پہلو بہ پہلو روح کی بالیدگی اور پرورش کا سامان بھی فراہم ہو سکے۔

اسلام علم کو مشرق و مغرب کے دو محدود اور سمٹے ہوئے خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ یہی نہیں اس کے ہاں دینی و دنیوی علوم کی تنگ نظرانہ دوئی (Dualism) بھی ناقابلِ فہم ہے۔ اس کے نزدیک علم صرف روشنی ہے جو اپنی ذات میں نہ مشرقی ہے نہ مغربی۔ اس سے اگر دین کے دریچے وا ہوتے ہیں، حق و صداقت کی راہیں کشادہ و ہموار ہوتی ہیں اور ایمان و عقیدے کی ضوفشانیوں کو مزید جلا ملتی ہے تو یہ عین دین ہے۔ اگرچہ اس پر چھاپ طبیعیات، فلسفہ اور نفسیات کی لگی ہو، اور اگر اس کے برعکس نام دینی کتابوں اور علوم کا لیا جائے اور ان کو پیش اس انداز سے کیا جائے کہ اس سے تنگ نظری، حسد و منافست، جہل و تعصب اور اختلاف و تشتت کی آگ اور بھڑک اُٹھے تو علم کا یہ انداز و اسلوب قطعی غیر دینی قرار پائے گا۔ علم حق و صداقت کی طلب و جستجو سے تعبیر ہے، سچائی کو جاننے اور پا لینے سے عبارت ہے، اس کا کوئی نام ہو، کوئی عنوان ہو۔ یہ بہرحال کسی نہ کسی حقیقت کی طرف اشارہ کناں ہے۔ اس کی ہر شاخ اور ہر ہر پتہ اس جڑ اور زمین کا پتا دیتی ہے جو اس کی پرورش اور نشو و نما کی حقیقی ضامن ہے۔ کوئی علم فی نفسہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کافرانہ اور ملحدانہ نہیں۔ ہاں انسان البتہ کج فہمی سے ملحد اور کافر ہو جاتا ہے، لیکن غور کیجیے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ اگر مرمریں اور شفاف فرش سے کسی کا پاؤں پھسل جاتا ہے یا بادِ خنک کا حیات آفریں جھونکا کسی کی طبع نازک پہ گراں گزرتا ہے تو اس میں ذمہ داری کس کی ہے؟ ہم نے جہاں تک سوچا، پڑھا اور تحقیق کی ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ ہر ہر علم کوچۂ یار میں سے ہو کر گزرتا ہے اور پکار پکار کر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود باجود اور اس کا تصورِ توحید، کائنات کی وہ سب سے بڑی سچائی اور روشنی ہے جس کو مانے بنا ہم کسی ایسی تہذیب کا تصور تک نہیں کر سکتے جو انسان کے لیے خیر و برکت کا باعث ثابت ہو سکے۔

اسلام کا دائرۂ علمی کتنا وسیع ہے اور اس ہمہ گیری کا کیا عالم ہے؟ اس کا اندازہ اس اسلوبِ فکر سے لگایا جا سکتا ہے کہ پہلے ہم دیکھ لیں کہ وہ تمام معادن اور علوم جن سے انسانی ذہن و فکر نے مختلف اوقات میں اب تک تعرض کیا ہے، کیا ہیں؟ اور پھر یہ دیکھیں کہ آیا قرآن حکیم نے ان جملہ علوم و معارف کی اہمیت کو واضح کیا اور نکھارا ہے یا نہیں۔ انسانی فکر کی پوری تاریخ آپ کے سامنے ہے، آپ اس کے سرسری مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انسانی طلب و جستجو اور تفحص و تلاش کے تین ہی بنیادی محور رہے ہیں۔ الٰہیات، یہ عالمِ رنگ و بو اور انسان۔

اب آیے ہم قرآن حکیم کی طرف رجوع ہوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس کتاب رشد و ہدایت نے ان مسائل کے بارے میں کن چشم کشا اور مبنی بر حقیقت نکات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ الٰہیات میں سرفہرست اثباتِ باری اور توحیدِ باری کا مسئلہ ہے۔ قرآن حکیم نے ان سے متعلق جن حکیمانہ معارف کی نشاندہی کی وہ یہ ہیں:

۱۔ اثبات باری کے دلائل اور تصورِ توحید ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ قرآن حکیم کے نزدیک اگر اللہ تعالیٰ کا وجود باجود ثابت ہے اور یقیناً ثابت ہے تو وہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، دو یا دو سے زیادہ نہیں۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ﴿الانبیا: ۲۲﴾ قرآن حکیم کی اس آیت میں تعددِ آلہہ کے تصور میں جو منطقی تضاد پنہاں ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔ تضاد یہ ہے کہ اگر دو یا دو سے زیادہ خدا مانیں جائیں تو پھر کائنات میں کسی ایسے قانونِ فطرت کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا جس کی یکساں اور کلی طور پر زمان و مکان پر حکمرانی پائی جائے۔

۲۔ اثبات باری کے مسئلے کو قرآن حکیم بحث و استدلال کی فتنہ طرازیوں سے بالا ایک مسلمہ حقیقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (ابراہیم ۱۰)

۳۔ اثباتِ باری کا مسئلہ قرآنِ کریم کے نزدیک انسانی فطرت کے اقرار و شہادت کا مسئلہ ہے جو اس کے دل کی گہرائیوں میں ازل سے نقش ہے:

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات: ۲۱)

۴۔ توحید قرآنی تعلیمات کا وہ مابہ ناز مسئلہ ہے، جس پر ہماری ذہنی، فکری اور عملی زندگی کا تمام تر دارومدار ہے۔ قرآنِ حکیم کے نزدیک یہ مسئلہ ریاضی کا نہیں، ذہن و فکر کے نکھار کا مسئلہ ہے اور اس کو مان لینے سے نہ صرف بے جا توہمات کے دل بادل چھٹ جاتے ہیں اور سوچنے کا اسلوب یکسر منطقی اور سائنسی ہو جاتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے انسان میں شرف و عظمت کا احساس زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ مزید برآں انسانی معاشرے میں اخوت و مساوات کے داعیے اُبھر کر ہر نوع کے طبقاتی اختلافات کو ختم کر دیتے ہیں اور ہر ہر انسان کو عبدیت کے اس مقام پر لا کھڑا کرتے ہیں جہاں صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت و عظمت کا غلبہ محسوس ہوتا ہے، دوسروں کا نہیں۔

اس کائناتِ رنگ و بو کے بارے میں قرآنِ حکیم نے جن نکات کی طرف توجہ دلائی وہ یہ ہیں:

۱۔ یہ عالم، وہم و خیال کا زائیدہ، یا محض اعیان و ظلال کی تجلی نہیں ہے، جیسا کہ افلاطون، ابن عربی، یا ہندو فلسفہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے، بلکہ یہ ایک حقیقی دنیا یا معروضی وجود ہے جو معقولات کی مناسبت میں پایا جاتا ہے۔ سورہ الحجر میں ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ط (۸۵)

۲۔ یہ کائناتِ ارضی اس قابل ہے کہ ہم زمین پر رہ کر اس کو سنواریں اور یہاں کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں۔ سورۂ بقرہ میں ہے: وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ٥ (۳۶)

۳۔ یہ دنیا اگرچہ ایک ارتقائی عمل سے معرضِ وجود میں آئی ہے، لیکن اس ارتقا کا نقطۂ آغاز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے: بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (الانعام: ۱۰۱)

۴۔ اس کائنات کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ اس کے ہر ہر ظہور میں حکم و عبر کا ایک سمندر موجزن ہے، اس پر غور و فکر ہونا چاہیے کہ جن کی روشنی میں تسخیرِ کائنات کی مہم سر ہو سکے۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿ (آل عمران : ۱۹۰)

انسان اور اس سے متعلق تمام ان مسائل و انداز پر قرآن حکیم نے کھل کر روشنی ڈالی ہے جو اس کی تگ و دو اور ارتقا کے لیے ضروری ہو۔ قرآن حکیم نے بتایا کہ :

۱۔ انسان ہر طرح کی تکریم و اعزاز کا مستحق ہے : وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل)

۲۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے علم و عرفان کی تمام تر صلاحیتوں کو اس کی فطرت میں سمو دیا ہے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ : ۳۱)

۳۔ نیز یہ کہ انسان ہی اس کائنات کا دولہا اور مقصود ہے اور اسی کے فائدہ کے لیے اس بزم کون کو سجایا اور آراستہ کیا گیا ہے : هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ق (البقرہ : ۲۹)

۴۔ انسان کے بارے میں سب سے بڑی حقیقت جس کی قرآن حکیم نے پردہ کشائی فرمائی یہ ہے کہ یہ صرف مادی عناصر کی ترکیب و امتزاج ہی کا کرشمہ نہیں بلکہ اس کی تخلیق میں نفخہ الٰہی بھی کارفرما ہے : فَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر : ۲۹)

گویا انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے تو خاکی ہی نہیں نوری و یزدانی بھی ہے۔ ان تصریحات کے علاوہ خود معاشرے اور ان میں رشتہ و تعلق کی تمام اقسام کے بارے میں قرآن حکیم نے واضح تعلیمات دی ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کیوں کہ ان میں ہر ایک تفصیل ایسی ہے جو مجلدات کی متقاضی ہے۔ اختصار کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم نے تمام انسانی تعلقات کے لیے دو بنیادی اصول متعین کر دیے ہیں، جن کے بل پر ایک صحت مند اور ارتقا پذیر معاشرے کی تشکیل کی جا سکتی ہے اور وہ ہیں، عدل اور احسان۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل : ۱۶)

عدل کے معنی یہ ہیں کہ ہر ہر فرد کو وہ سب کچھ ملنا چاہیے جس کا وہ متمنی ہے۔ اور احسان سے یہ مراد ہے کہ معاشرے کی تعمیر و تکمیل میں ہر ہر انسان کو اپنے فرائض اور ذمے داریوں کو اس حسن و خوبی اور بے لوثی سے انجام دینا چاہیے کہ وہ دنیوی کامرانیوں سے بھی ہم کنار ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کو سرخروئی سے نوازا جائے۔

یہ ہے علم کا وہ وسیع تر تصور جس کی وجہ سے جہاں قرآن، حدیث اور فقہ میں جہابذہ فن نے اپنے کمال کا مظاہرہ کیا، وہاں کندی، فارابی، جوینی، غزالی اور ابن رشد، ابن الہیثم، زہراوی، ابن خلدون اور رازی ایسے عظیم فلاسفہ و حکما اور تاریخ و جغرافیہ کے ماہرین نے علم و تجربے کی مختلف النوع شاخوں میں نام پیدا کیا۔

© rasailojaraid.com